گیا، لیکن میں سورداس کے ساتھ کہیں ایسی زیادتی تو نہیں کر رہا ہوں کہ بالآخر مجھے شہر والوں کے سامنے نادم ہونا پڑے۔ اسی معاملہ پر گفتگو کرنے کے لیے وہ اندو کے پاس گئے اور بولے۔ ''تم کوئی ضروری کام تو نہیں کر رہی ہو۔ مجھے ایک معاملہ میں تم سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔''

اندو ڈر گئی کہ کہیں مشورہ ہوتے ہوتے تنازع کی نوبت نہ آئے۔ بولی۔ ''کام تو کچھ نہیں کر رہی ہوں، لیکن میں آپ کو کوئی صلاح دینے کے قابل نہیں ہوں۔ ایشور نے مجھ کو اتنی عقل ہی نہیں دی۔ مجھے تو اس نے کھانے سونے اور آپ کو دق کرنے کے لیے بنایا ہے۔''

راجہ صاحب: تمہارے دق کرنے ہی میں تو مزہ آتا ہے۔ بتلاؤ۔ سورداس کی زمین کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟

اندو: آخر آپ نے کیا تجویز کیا؟

راجہ صاحب: پہلے تم بتاؤ تو پھر میں بتاؤں گا۔

اندو: میرے رائے میں تو سورداس سے اس کے باپ دادوں کی زمین چھین لینا سراسر انصاف کے خلاف ہوگا۔

راجہ صاحب: تمہیں معلوم ہے کہ سورداس کو اس زمین سے کوئی نفع نہیں پہنچ رہا ہے۔ صرف ادھر ادھر کے مواشی چرا کرتے ہیں۔

اندو: اسے یہ اطمینان تو ہے کہ یہ زمین میری ہے۔ محلّہ والے اس کا احسان تو مانتے ہی ہوں گے۔ اس کی مذہبی خواہش اس کار ثواب سے پوری ہوتی ہوگی۔

راجہ صاحب: لیکن میں شہر کے ایک خاص منتظم کی حیثیت سے ایک شخص کے واقعی یا فرضی فائدہ کے لیے شہر کے ہزاروں روپیہ کا نقصان تو نہیں کر سکتا۔ کارخانہ کھلنے سے ہزاروں مزدوروں کی پرورش ہوگی۔ شہر کی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس بے شمار دولت کا ایک حصہ ملک میں رہ جائے گا جو سگریٹ

کے لیے دوسرے ملکوں کے حوالہ کر دینا پڑتا ہے۔

اندو نے راجہ صاحب کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ سوچنے لگی۔ ان کا مطلب کیا ہے؟ سرمایہ داروں سے تو ان کو کوئی خاص انس نہیں ہے۔ یہ تو مشورہ نہیں۔ بحث ہے۔ کیا حکام کے دباؤ سے انہوں نے زمین کو مسٹر سیوک کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا ہے اور مجھ سے اپنی تجویز کی تائید کرانی چاہتے ہیں۔ ان کی باتوں سے تو کچھ ایسا ہی ظاہر ہو رہا ہے۔ بولی۔ ''اس نقطہ خیال سے تو یہی قرین انصاف ہے کہ سورداس سے وہ زمین چھین لی جائے۔''

راجہ صاحب: بھئی۔ اتنی جلدی پہلو بدلنے کی سند نہیں۔ اپنی اسی دلیل پر قائم رہو۔ میں صرف مشورہ نہیں چاہتا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اس کے متعلق کیا کیا اعتراضات کر سکتی ہو اور میں ان کا معقول جواب دے سکتا ہوں یا نہیں؟ مجھے تو جو کچھ کام کرنا تھا کر چکا۔ اب تم سے بحث کر کے اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔

اندو: اگر میری زبان سے کوئی لفظ خلاف مزاج نکل جائے تو آپ ناراض تو نہ ہوں گے؟

راجہ صاحب: اس کی پروانہ کرو۔ قومی خدمت کا دوسرا نام بے حیائی ہے۔ اگر ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہونے لگیں تو ہمیں پاگل خانہ جانا پڑے۔

اندو: اگر ایک شخص کے ذاتی مفاد کے لیے آپ شہر کا نقصان نہیں کرنا چاہتے تو کیا سورداس ہی ایسا شخص ہے جس کے پاس دس بیگھے زمین ہو۔ شہر میں ایسے لوگ بھی تو ہیں جن کے پاس اس سے کہیں زیادہ زمین ہے۔ کتنے ہی ایسے بنگلے ہیں جن کا احاطہ دس بیگھے سے زیادہ ہے۔ ہمارے بنگلہ کا احاطہ پندرہ بیگھے سے کم نہ ہوگا۔ مسٹر سیوک کے بنگلہ کا بھی پانچ بیگھے سے کم نہیں ہے اور دادا جی کا بنگلہ تو پورا ایک گاؤں ہیہ۔ آپ ان میں سے کہیں کی زمین اس کارخانہ کے لیے لے سکتے ہیں۔ سورداس کی زمین تو محلّہ کے مویشی چرتے ہیں۔ زیادہ نہیں تو ایک محلّہ کا فائدہ تو ہوتا

ہی ہے۔ ان احاطوں تو ایک تنہا شخص کے سوا کسی کا بھی کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ کوئی ان میں سیر بھی نہیں کر سکتا۔ ایک پھول یا پتی بھی نہیں توڑ سکتا۔ اگر کوئی جانور اندر چلا جائے تو اسے فوراً گولی ماردی جائے۔

راجہ صاحب: (مسکرا کر) واقعی دلیل بڑے معرکہ کی ہے۔ قائل ہو گیا۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں، لیکن تمہیں شاید معلوم نہیں کہ تم اس اندھے جو جتنا بے بس و بے کس سمجھتی ہو اتنا نہیں ہے۔ سارا محلّہ اس کی حمایت پر آمادہ ہے۔ یہاں تک کہ لوگ مسٹر سیوک کے گماشتے کے گھر میں گھس گئے۔ ان کے بھائیوں کو مارا۔ آگ لگادی۔ عورتوں تک کی بے عزتی کی۔

اندو: میرے خیال میں ایسا ہونا اس بات کی ایک اور دلیل ہے کہ وہ زمین چھوڑ دی جائے۔ اس پر قبضہ کر لینے سے ایسے واقعات کم نہ ہوں گے۔ زیادہ ہی ہوں گے۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ کہیں خون خرابہ نہ ہو جائے۔

راجہ صاحب: جو لوگ عورتوں کی بے عزتی کی سکتے ہیں وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں۔

اندو: جن لوگوں کی زمین آپ چھین لیں گے وہ آپ کے پاؤں نہ سہلائیں گے۔

راجہ صاحب: تعجب ہے کہ تم عورتوں کی بے حرمتی کو معمولی بات سمجھ رہی ہو۔

اندو: فوج کے گورے۔ ریل کے ملازمین روز ہی ہماری بہنوں کی بے حرمتی کرتے رہتے ہیں۔ ان سے تو کوئی نہیں بولتا۔ اسی لیے کہ آپ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اگر لوگوں نے جرم کیا ہے تو ان پر مقدمہ چلائیے۔ انہیں سزا دلائیے۔ ان کی جائیدادیں ضبط کرتے ہیں۔

راجہ صاحب: تم جانتی ہو۔ مسٹر سیوک کا یہاں کے حکام میں کتنا ربط ضبط ہے۔ مسٹر کلارک تو ان کے دروازہ کے دربان بنے ہوئے ہیں۔ اگر میں ان کی اتنی

خدمت نہ کر سکا تو حکام کا اعتبار مجھ پر اسے اٹھ جائے گا۔

اندو: (متفکرانہ لہجہ میں) میں نہیں جانتی تھی کہ چیئرمین اس قدر مجبور و معذور ہوا کرتا ہے۔

راجہ صاحب: اب تو معلوم ہو گیا۔ بتلاؤ۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

اندو: عہدہ سے مستعفی ہو جانا۔

راجہ صاحب: میرے مستعفی ہو جانے سے زمین نہ بچ سکے گی۔

اندو: آپ تو دکھ پاپ سے بچ جائیں گے۔

راجہ صاحب: ایسی معمولی باتوں کے لیے استعفا دے دینا مضحکہ خیز ہے۔

اندو کو اپنے شوہر کے چیئرمینی پر بہت ناز تھا۔ اس عہدہ کو وہ نہایت اعلیٰ اور قابل احترام سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں راجہ صاحب کامل طور رپ خود مختار ہیں۔ بورڈ ان کے تحت میں ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں، کرتے ہیں۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ محض اس کا خیال تھا۔ اس کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔ اسے آج معلوم ہوا کہ چیئرمین صرف حکام کے ہاتھوں کا کھلونا ہے۔ ان کی مرضی جو چاہے کرے۔ ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ بمنزلہ صفر ہے۔ جس کی قیمت دوسرے عدد کے ساتھ ملنے ہی پر ہے۔ راجہ صاحب کی اس عہدہ پرستی سے اس کے دل پر کڑی چوٹ لگی۔ مضحکہ اتنا شرمناک نہیں ہے جتنا بے انصافی برتنا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے اس عہدہ کی مشکلات کو جانتے ہوئے بھی اسے کیوں قبول کیا؟ اگر آپ انصاف کے خیال سے سورداس کی زمین چھین لیتے تو مجھے آپ سے کوئی شکایت نہ ہوتی، لیکن صرف حکام کے خوف سے یا بدنامی سے بچنے کے لیے جادۂ انصاف سے منحرف ہونا نہایت اوچھی حرکت ہے۔ آپ کو اہل شہر اور خصوصاً غربا کے حقوق کی حفاظت کرنی چاہیے۔ اگر حکام کسی پر زیادتی کریں تو آپ کو مناسب ہے کہ مظلوموں کی مدد کریں۔ اپنے ذاتی نفع یا نقصان کا خیال نہ کر کے حکام کی مخالفت

کریں ۔ سارے شہر میں بلکہ سارے ملک میں تہلکہ مچا دیں ۔ خواہ اس کے لیے استعفیٰ ہی نہیں، کسی بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے ۔ میں سیاسی اصولوں سے واقف نہیں ہوں، لیکن آپ کا جو انسانی فرض ہے، اسے بتلا رہی ہوں ۔ میں آپ کو آگاہ کیے دیتی ہوں کہ اگر آپ نے حکام کے دباؤ سے سورداس کی زمین لے لی تو میں چپ چاپ نہ بیٹھی رہوں گی ۔ عورت ہوں تو کیا ۔ پر دکھا دوں گی کہ زیادہ سے زیادہ طاقتور انسان بھی کسی غریب کو آسانی سے پیروں تلے نہیں روند سکتا ۔

یہ کہتے کہتے اندو رک گئی ۔ اسے خیال آ گیا کہ میں جوش میں آ کر حد مناسب سے تجاوز کر رہی ہوں ۔ راجہ صاحب اس قدر نادم ہوئے کہ کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہ ملتے تھے ۔ بالآخر ندامت سے بولے ۔ ''تمہیں معلوم نہیں کہ قومی خدمت گزاروں کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ اگر وہ اپنے فرائض کو بے خوفی سے ادا کرنے لگیں تو جتنی خدمت وہ اب کر سکتے ہیں اتنی بھی نہ کر سکیں ۔ مسٹر کلارک اور مسٹر سیوک میں گہرا تعلق ہو جانے کے سبب حالات بالکل تبدیل ہو گئے ہیں ۔ مس سیوک جس وقت سے تمہارے مکان سے گئی ہیں، مسٹر کلارک ہمیشہ انہی کے پاس بیٹھے رہتے ہیں ۔ اجلاس پر نہیں جاتے ۔ کوئی سرکاری کام نہیں کرتے ۔ کسی سے ملتے تک نہیں ۔ مس سیوک نے ان پر جادو سا ڈال دیا ہے ۔ دونوں ساتھ ساتھ سیر کرنے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ تھیٹر دیکھنے جاتے ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ مس سیوک نے شادی کا وعدہ کر لیا ہے ۔''

اندو: اس قدر جلد ۔ ابھی اسے ہمارے یہاں سے گئے ایک ہفتہ سے زیادہ نہ ہوا ۔''

راجہ صاحب: مسز سیوک نے سب کچھ پہلے ہی طے کر رکھا تھا ۔ مس سیوک کے وہاں جاتے ہی عشق کی کارپردازیاں شروع ہو گئیں ۔

اندو نے اب تک صوفیہ کو ایک معمولی عیسائی لڑکی سمجھ رکھا تھا ۔ اگرچہ وہ ان سے

بہن کا سا برتاؤ کرتی تھی۔ اس کی قابلیت کی قدر کرتی۔ اس سے محبت کرتی تھی، لیکن دل میں اسے اپنے سے کمتر سمجھتی تھی مگر مسٹر کلارک سے اس کی شادی والی بات نے اس کے دلی جذبات کو محرک کر دیا۔ وہ سوچنے لگی۔ مسٹر کلارک سے عقد ہو جانے کے بعد جب صوفیہ مسز کلارک بن کر مجھے ملے گی تو اپنے دل میں مجھے ہیچ سمجھے گی۔ اس کے ارتباط، اخلاق اور الفاظ میں مصنوعی رواداری کی جھلک ہوگی۔ وہ میرے سامنے جتنا ہی جھکے گی، اتنا ہی میرا سر نیچا کرے گی۔ یہ ذلت مجھ سے برداشت نہ ہوگی۔ میں اس سے نیچی بن کر نہیں رہ سکتی۔ اس کمبخت کلارک کو کیا کوئی یورپین لیڈی نہ ملتی تھی کہ صوفیہ پر گر پڑا۔ کسی ادنیٰ خاندان کا ہوگا۔ کوئی انگریز اس سے اپنی لڑکی کا عقد کرنے پر راضی نہ ہوتا ہوگا۔ وہ نے اسی چھچھوری عورت پر جان دیتا ہے۔ ایشور ہی جانے اب اس غریب کی کیا حالت ہوگی۔ قحبہ ہے اور کیا۔ نسل اور خاندان کا اثر کہاں جائے گا۔ خوب صورت ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ ہوشیار ہے۔ عقل مند ہے۔ سب کچھ سہی مگر ہے تو عیائن۔ باپ نے لوگوں کو ٹھگ ٹھگا کر کچھ روپیہ اور نام کما لیا ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو اب بھی اس سے وہی پہلے کا سا برتاؤ کروں گی۔ جب تک وہ خود آگے نہ بڑھے گی ہاتھ نہ بڑھاؤں گی، لیکن میں خواہ کچھ بھی کروں، اس پر اپنی فوقیت کا خواہ کتنا ہی اظہار کروں، اس کے دل میں اس بات کا گھمنڈ تو ضرور ہی ہوگا کہ میری ایک کڑی نگاہ اس کے شوہر کے اعزاز و اقتدار کو خاک میں ملا سکتی ہے۔ ممکن ہے وہ اب اور بھی زیادہ انکسار سے پیش آئے۔ اپنی طاقت کا احساس ہم کو مہذب بنا دیتا ہے۔ اس سے میرا غرور کرنا اور کھنچا دل لگی معلوم ہوگی۔ اس وقت دیکھنے والے اس کو اپنے دل میں ملامت کریں گے۔ اسی میں میری لاج رہ سکتی ہے مگر وہ اتنی کوتاہ اندیش کب ہے۔

بالآخر اندو نے طے کر لیا کہ میں صوفیہ سے ملوں گی ہی نہیں۔ میں اپنے رانی ہونے کا گھمنڈ تو اس سے کر ہی نہیں سکتی۔ ہاں ایک خادم قوم کی بیوی بن کر اپنی

خاندانی شرافت کا غرور دکھا کر اس سے بے اعتنائی کا برتاؤ کر سکتی ہوں۔

یہ سب خیالات ایک لمحہ میں اندو کے دل میں آ گئے۔ بولی۔ ''میں آپ کو کبھی دبنے کی صلاح نہ دوں گی۔''

راجہ صاحب: اروا گر دبنا پڑے۔

اندو: تو اپنے کو ابھاگنی سمجھوں گی۔

راجہ صاحب: یہاں تک تو کوئی ہرج نہیں مگر کوئی تحریک تو نہ شروع کرو گی۔ اس لیے پوچھتا ہوں کہ تم نے ابھی مجھے دھمکی دی ہے۔

اندو: میں خاموش نہ بیٹھوں گی۔ آپ دبیں۔ میں کیوں دبوں؟

راجہ صاحب: خواہ میری کتنی ہی بدنامی ہو جائے؟

اندو: میں اسے بدنامی نہیں سمجھتی۔

راجہ صاحب: پھر سوچ لو۔ یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ زمین مسٹر سیوک کو ضرور ملے گی۔ میں روکنا بھی چاہوں تو نہیں روک سکتا اور یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ تمہیں اس معاملہ میں خاموش ہی رہنا پڑے گا۔

راجہ صاحب اپنی پبلک لائف (عوام سے تعلق رکھنے والی زندگی) میں تحمل اور حسن اخلاق کے لیے مشہور تھے لیکن خانگی زندگی مین وہ اتنے رحم دل نہ تھے۔ اندو کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ تیز لہجہ میں بولی۔ ''اگر آپ کو اپنا اعزاز پیارا ہے تو مجھے بھی اپنا دھرم پیارا ہے۔''

راجہ صاحب غصہ کے مارے وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ اندو تنہا رہ گئی۔

ایک ہفتہ تک دونوں کی زبانوں پر مہر سکوت لگی رہی۔ راجہ صاحب کبھی گھر میں آ جاتے تو دو چار باتیں کر کے یوں بھاگتے جیسے پانی میں بھیگ رہے ہوں۔ نہ وہ بیٹھتے ار نہ اندو انہیں بیٹھنے کو کہتی۔ انہیں یہ رنج تھا کہ اس کو میری ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ قدم قدم پر میرا راستہ روکتی ہے۔ میں استعفیٰ دے دوں جبھی اس کو تسکین ہو گی۔ اس

کی یہی تمنا ہے کہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے منہ موڑ لوں۔ سنسار سے قطع تعلق کروں اور گھر میں بیٹھا ہوا رام نام جپوں۔ حکام سے ملنا چھوڑ دوں۔ ان کی نظروں سے گر جاؤں اور ذلت برداشت کروں۔ میری زندگی کی ساری تمنائیں اور میرے سارے منصوبے اس کی نگاہوں میں ہیچ ہیں۔ وہ دل میں میری نمود طلبی کی خواہش پر ہنستی ہے۔ شاید مجھے کم ظرف، خودغرض اور خودپسند سمجھتی ہے۔ اتنے دنوں تک میرے ساتھ رہ کر بھی اس کو مجھ سے کچھ محبت نہیں۔ کوئی میل نہیں۔ زوجہ اپنے خاوند کی بہی خواہ ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ اس کے کاموں کا مضحکہ اڑائے۔ اس کی بدگوئی کرے۔ اس نے صاف کہہ دیا ہے کہ میں خاموش نہ بیٹھوں گی۔ نہ جانے کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ اگر اخباروں میں ایک چھوٹا سا خط بھی چھپوائے گی تو میرا کام تمام ہو جائے گا۔ کہیں کا نہ رہوں گا۔ ڈوب مرنے کا موقع ہوگا۔ دیکھوں یہ ناؤ کیسے پار لگتی ہے۔

ادھر اندو کو افسوس تھا کہ ایشور نے انہیں سب کچھ دیا ہے۔ یہ حکام سے کیوں اتنا دبتے ہیں۔ کیوں اتنی خوشامد کرتے ہیں۔ اپنے اصولوں پر قائم کیوں نہیں رہتے۔ انہیں کیوں خودغرضی کے تحت میں رکھتے ہیں۔ قومی خدمت کا سوانگ کیوں بھرتے ہیں؟ وہ بھی کوئی انسان ہے جس نے نام ونمود کے لیے ایمان اور انصاف کا خون کر دیا ہو۔ ایک وہ بہادر لوگ تھے جو بادشاہوں کے سامنے سر نہ جھکاتے تھے۔ اپنی بات اپنی آن پر مر مٹتے تھے۔ آخر لوگ انہیں کیا کہتے ہوں گے؟ دنیا کو دھوکا دینا سہل ہے۔ انہیں چاہے یہ وہم ہو کہ لوگ مجھے قوم کا سچا خادم سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعی بات تو یہ ہے کہ انہیں سبھی لوگ خوب پہچانتے ہیں۔ دل میں سبھی کہتے ہوں گے کتنا بنا ہوا آدمی ہے۔

رفتہ رفتہ اس کے خیالات میں تغیر ہوا۔ یہ ان کا قصور نہیں، میرا قصور ہے۔ میں کیوں ان کا اپنے معیار کے مطابق بنانا چاہتی ہوں؟ آج کل زیادہ تر آدمی اسی قماش کے ہیں۔ انہیں دنیا چاہے کچھ کہے۔ کچھ سمجھے۔ مگر ان کے گھروں میں تو کوئی

مین میکھ نہیں نکالتا۔ بیوی کا فرض ہے کہ شوہر کی رفیق بنے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عورت کی مرد سے الگ کوئی ذاتی ہستی نہیں ہے؟ اسے تو عقل سلیم قبول نہیں کرتی۔ دونوں اپنے اپنے اعمال کے موافق سزا و جزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ دراصل یہ ہماری قسمت کا قصور ہے، ورنہ ہمارے خیالات میں اتنا فرق کیوں ہوتا؟ کتنا چاہتی ہوں کہ آپس میں کوئی نا اتفاقی نہ ہو۔ کتنا پہلو بچاتی ہوں، پر آئے دن کوئی نہ کوئی بدمزگی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ ابھی ایک زخم نہیں بھرنے پایا تھا کہ دوسرا چرکا لگا۔ کیا میری ساری زندگی یوں ہی گزرے گی؟ ہم زندگی میں سکون چاہتے ہیں۔ محبت اور دوستی کے لیے جان دیتے ہیں۔ جس کے سر پر ہمیشہ ننگی تلوار لٹکتی ہو، اسے سکون کہاں۔ اندھیر تو یہ ہے کہ مجھے چپ بھی نہیں رہنے دیا جاتا۔ کتنا کہتی تھی کہ مجھے اس بحث میں نہ ڈالیے۔ ان کانٹوں میں نہ گھسیٹیے مگر انہوں نے نہ مانا۔ اب جو میرے پیروں میں کانٹے چبھ گئے۔ میں درد سے کراہتی ہوں تو کانوں پر انگلی رکھتے ہیں۔ مجھے رونے کی بھی آزادی نہیں ''جبراً سارے اور رونے نہ دے'' والی مثال ہے۔ ایک ہفتہ ہو گیا۔ بات بھی نہ پوچھی کہ مرتی ہے یا جیتی۔ بالکل اسی طرح پڑی ہوں جیسے کسی سرائے میں۔ اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ مر جاتی۔ سکھ گیا۔ آرام گیا۔ پلے کی اپڑا۔ رونا اور جھیکنا! جب یہی حال ہے تو کب نبھے گی۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ دونوں کے دل ایک دوسرے سے پھر جائیں گے۔ کوئی کسی کی صورت بھی نہ دیکھنا چاہے گا۔

شام ہو گئی تھی۔ اندو کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ ذرا اماں کے پاس چلوں کہ یکا یک راجہ صاحب آ کر کھڑے ہو گئے۔ چہرہ سے وحشت برس رہی تھی جیسے گھر میں آگ لگی ہوئی ہو۔ گھبرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''اندو مسٹر کلارک ملنے آئے ہیں۔ ضرور اسی زمین کے متعلق کچھ گفتگو کریں گے۔ اب مجھے کیا صلاح دیتی ہو؟ میں ایک کاغذ لانے کا بہانہ کر کے چلا آیا ہوں۔''

یہ کہہ کر انہوں نے دکھ بھری نگاہوں سے اندو کی طرف دیکھا۔ گویا ساری دنیا کی مصیبت انہی کے سر آ پڑی ہو۔ گویا کوئی دہقانی پولیس کے پنجہ میں پھنس گیا ہو۔ ذرا دم لے کر پھر بولے۔ ''اگر میں نے ان کی مخالفت کی تو مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ ان انگریز حکام کو کتنے اختیارات ہوتے ہیں۔ یوں چاہوں تو اسے نوکر رکھ لوں مگر اس کی ایک شکایت پر میری ساری آبرو پر پانی پھر جائے گا۔ حکام بالا دست اس کے خلاف میری ایک بھی نہ سنیں گے۔ رئیسوں کو اتنی آزادی بھی نہیں جو ایک معمولی کسان کو ہے۔ ہم سب ان کے ہاتھوں کے کھلونے ہیں۔ جب چاہیں زمین پر پٹک کر چکنا چور کر دیں۔ میں اس کی بات ٹال نہیں سکتا۔ مجھ پر رحم کرو۔''

اندو نے ترحمانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ ''مجھے آپ کیا کرنے کو کہتے ہیں؟''

راجہ صاحب: یہی کہ یا تو خاموش رہ کر اس بے انصافی اور ستم کوشی کا تماشا دیکھو یا مجھے اپنے ہاتھوں سے تھوڑا سا سنکھیا کھلا دو۔

راجہ صاحب کی اس بزدلی اور مجبوری پر ان کے خوف زدہ چہرہ اور قابل رحم عاجزی و التجا پر اندو کو رحم آ گیا۔ اس رحم میں ہمدردی یا خاطر داری نہ تھی۔ یہ وہ رحم تھا جو بھکاری کو دیکھ کر کسی فیاض طبع انسان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ سوچنے لگی، ہائے اس خوف کا بھی کوئی ٹھکانا ہے۔ بچے ہوا سے بھی اتنا نہ ڈرتے ہوں گے۔ مان لیا کلارک ناراض ہی ہو گیا تو کیا کرے گا۔ عہدہ سے برطرف نہیں کر سکتا، یہ اس کے اختیار سے باہر ہے۔ ریاست ضبط نہیں کر سکتا۔ واویلا مچ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ اتن اکر سکتا ہے کہ افسروں سے شکایت کر دے، لیکن اس وقت ان سے بحث کرنا بے فائدہ ہے۔

راجہ صاحب چپکے سے اٹھے اور چلے گئے۔ اسی طرح جیسے کوئی غرض سے باؤلا اسامی مہاجن کے انکار سے مایوس ہو کر اٹھے۔ اندو کی تشفی سے انہیں اطمینان نہ ہوا۔

سوچنے لگے کہ میں اس کی نظروں میں گر گیا۔ میں بدنامی سے اس قدر ڈرتا تھا مگر اب گھر ہی میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔

بولی۔ ''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کلارک سے بحث کرنا میرے لیے مناسب نہیں تو میں خاموش رہوں گی اور آپ کے کام میں دخل اندازی نہ کروں گی۔''

راجہ صاحب کے جاتے ہی اندو نے ایک لمبی سانس لی اور فرش پر لیٹ گئی۔ اس کے منہ سے یکا یک یہ الفاظ نکلے۔ ''ان کی دل سے کیسے عزت کروں؟ انہیں اپنا دیوتا کیسے سمجھوں؟ معلوم نہیں۔ اس ناعقیدت مندی کی مجھے کیا سزا ملے گی۔ میں اپنے شوہر کی پرستش کرنا چاہتی ہوں۔ مگر دل پر میرا قابو نہیں۔ بھگوان! تم مجھے اس کڑی آزمائش میں کیوں ڈال رہے ہو؟''

(16)

اراوالی کی پہاڑیوں میں ایک برگد کے درخت کے نیچے ونے سنگھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ برسات نے اس سنسان، سخت، خشک اور پتھریلے علاقے میں رونق پیدا کر دی ہے مگر ونے کی نگاہ میں اس قدرتی حسن کی طرف نہیں ہے۔ ان کے دل میں ہر وقت ایک کشمکش قائم رہتی ہے۔ قومی خدمت ان کا مقصد تھا۔ محبت کے کانٹے اس میں رکاوٹ پیدا کر رہے تھے۔ وہ ہر وقت اس مقصد کے آڑے آتے تھے۔ کبھی کبھی وہ درد دل سے بےقرار ہو کر سوچتے ہیں۔ صوفی نے مجھے اس آتش کدہ سے کیوں نکالا؟ بیرونی آگ صرف جسم کو فنا کرتی ہے جو خود ہی فانی ہے مگر اندرونی آگ روح کو خاک سیاہ کر دیتی ہے۔

ونے کو یہاں آئے کئی مہینے ہو گئے مگر ان کی دل کی بےچینی وقت کے ساتھ ہی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ غیرت کے سبب آنے کو تو یہاں آ گئے تھے مگر ایک ایک لمحہ ایک ایک مدت کی طرح گزر رہا تھا۔ پہلے انہوں نے یہاں کی تکالیف کی طولانی داستانیں لکھ لکھ کر اپنی ماں کے پاس بھیجیں۔ انہیں یقین تھا کہ اماں جی مجھے بلا لیں

گی مگر وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ اتنے ہی میں صوفیہ کا خط مل گیا جس نے ان کے صبر کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو ایک دم ٹھنڈا کر دیا۔ اب ان کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ وہ اس اندھیرے میں چاروں طرف ٹٹولتے پھرتے تھے مگر راستہ نہ ملتا تھا۔ اب ان کی زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہے۔ کوئی مقررہ راستہ نہیں ہے۔ وہ بے ملاح کی ناؤ تھے جسے صرف امواج کے رحم کا بھروسہ ہو۔

لیکن اس تفکر اور تشویش کی حالت میں بھی وہ حتی الامکان اپنے فرض کو ادا کرتے جاتے ہیں۔ جسونت نگر کے علاقہ میں ایک بچہ بھی نہیں ہے جو انہیں نہ پہچانتا ہو۔ دیہات کے لوگ ان کے اتنے معتقد ہو گئے ہیں کہ جوں ہی وہ کسی گاؤں میں جا پہنچتے ہیں، سارا گاؤں ان کی زیارت کے لیے جمع ہو جاتا ہے۔ انہوں نے ان کو اپنی مدد آپ کرنا سکھایا ہے۔ اس علاقہ کے لوگ اب جنگلی جانوروں کو بھگانے کے لیے پولیس کے پاس نہیں دوڑے جاتے بلکہ خود جمع ہو کر انہیں بھگاتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر عدالتوں کے دروازے نہیں کھٹکھٹائے جاتے۔ پنچائتوں میں تصفیہ کر لیتے ہیں۔ جہاں کبھی کنوئیں نہ تھے، وہاں اب پختہ کنوئیں تیار ہو گئے ہیں۔ صفائی کی طرف بھی لوگ دھیان دینے لگے ہیں۔ دروازوں پر کوڑا کرکٹ کے ڈھیر نہیں جمع کیے جاتے۔ خلاصہ یہ کہ ہر شخص صرف اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی ہے۔ وہ اب اپنے مخالفین سے گھرا ہوا نہیں بلکہ معاونین سے گھرا ہوا سمجھتا ہے۔ اجتماعی زندگی کا پھر احساس پیدا ہو گیا ہے۔

ونے سنگھ کو طبابت میں بھی کافی دخل ہے۔ ان کے ہاتھوں سینکڑوں مریض صحت یاب ہو چکے ہیں۔ کتنے ہی گھر جو باہمی نزاع سے بگڑ گئے تھے پھر آباد ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کی جتنی خاطر و مدارت کرنے کے لیے لوگ تیار رہتے ہیں، ان کا قیاس کر لینا مشکل نہیں۔ دوسروں کی خدمت کرنے والوں کے نصیبوں میں آرام کہاں۔ ونے کو خشک روٹیوں اور درخت کے سایہ کے علاوہ اور کسی چیز سے سروکار

نہیں ہے۔ اس فقر و استغناء نے انہیں اس نواح میں نہایت ممتاز اور ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔

لیکن جوں جوں ان سے رعایا کی عقیدت ہوتی جاتی ہے، اسی نسبت سے ریاست کے حکام ان سے بدگمان ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے خیال میں رعایا روز بروز سرکش ہوتی جاتی ہے۔ داروغہ جی مٹھیاں اب گرم نہیں ہوتیں۔ کامدار اور دیگر حاکموں کے یہاں مقدمے نہیں جاتے۔ کچھ ہتھے نہیں چڑھتا۔ رعایا میں یہ آثار بغاوت نہیں تو اور کیا ہیں۔ یہی بغاوت کے ننھے پودے ہیں۔ انہیں اکھاڑ دینے ہی میں بہتری ہے۔

جسونت نگر سے روزانہ دربار کو نئی نئی اطلاعیں کچھ اصلی کچھ فرضی بھیجی جاتی تھیں اور وِنے سنگھ کو ضابطے کے شکنجہ میں جکڑنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ دربار نے ان اطلاعوں سے بدظن ہو کر کئی جاسوسوں کو وِنے سنگھ کی حرکات وسکنات کی دیکھ بھال کے لیے تعینات کر دیا ہے مگر ان کی بےلوث خدمات کسی کو گرفت کا موقع نہیں دیتیں۔

وِنے کے پیروں میں بوائیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ چلنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ برگد کے نیچے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگی تو بیٹھے بیٹھے سو گئے آنکھ کھلی تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ فوراً اٹھ بیٹھے، لکڑی سنبھالی اور آگے بڑھے۔ آج انہوں نے جسونت نگر میں مقام کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ دن بھاگا چلا جاتا تھا۔ سہ پہر کے بعد سورج کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ شام ہوتی جاتی تھی اور ابھی جسونت نگر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ادھر بوائیوں کے سبب ایک ایک قدم چلنا دوبھر تھے۔ حیران تھے کہ کیا کروں۔ کسی کسان کا جھونپڑا بھی نظر نہ آتا تھا کہ وہیں رات کاٹیں۔ پہاڑوں میں سرِ شام ہی سے جنگلی جانوروں کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ اسی حیص بیص میں پڑے ہوئے تھے کہ دفعتاً انہیں دور سے ایک آدمی آتا ہوا نظر پڑا۔ اسے دیکھ کر وہ اتنا خوش ہوئے کہ اپنی راہ چھوڑ کر کئی قدم اس کی طرف چلے۔ نزدیک آنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکیہ ہے۔ وہ وِنے سنگھ کو

پہچانتا تھا۔ سلام کر کے بولا۔ ''اس چال سے تو آدھی رات تک بھی جسونت نگر نہ پہنچیں گے۔''

ونے: پیروں میں بوائیاں پھٹ گئی ہیں۔ چلنا مشکل ہے۔ تم خوب ملے۔ میں بہت گھبرا رہا تھا کہ تنہا کیسے جاؤں گا..... اب ایک سے دو ہو گئے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ میرا بھی کوئی خط ہے؟

ڈاکیہ نے ونے سنگھ کے ہاتھ پر ایک خط رکھ دیا۔ رانی صاحبہ کا خط تھا۔ اگرچہ اندھیرا ہو رہا تھا مگر ونے سنگھ نے فرط اشتیاق سے فوراً لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنے لگے۔ ایک لمحہ میں انہوں نے اس کو پڑھ ڈالا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر لفافہ میں رکھ دیا۔ ان کے سر میں ایسا چکر آیا کہ گرتے گرتے بچے۔ زمین پر بیٹھ گئے۔

ڈاکیہ نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا کوئی بری خبر ہے؟ آپ کا منہ پیلا پڑ گیا ہے۔''

ونے سنگھ: نہیں۔ کوئی ایسی خبر نہیں۔ پیروں میں درد ہو رہا ہے۔ شاید میں آگے نہ جا سکوں گا۔

ڈاکیہ: یہاں اس بھیڑ میں اکیلے کیسے پڑے رہیے گا؟

ونے سنگھ: ڈر کیا ہے؟

ڈاکیہ: ادھر جانور بہت ہیں۔ ابھی کل ایک گائے اٹھا لے گئے۔

ونے سنگھ: مجھے جانور بھی نہ پوچھیں گے۔ تم جاؤ مجھے یہیں چھوڑ دو۔

ڈاکیہ: یہ نہیں ہو سکتا۔ میں بھی یہیں پڑا رہوں گا۔

ونے سنگھ: تم میرے لیے کیوں اپنی جان خطرہ میں ڈالتے ہو؟ چلے جاؤ۔ گھڑی رات گئے تک پہنچ جاؤ گے۔

ڈاکیہ: میں تو جبھی جاؤں گا جب آپ بھی چلیں گے۔ میری جان کی کون حقیقت ہے۔ اپنا پیٹ پالنے کے سوا اور کیا کرتا ہوں۔ آپ کے دم سے تو ہزاروں کا بھلا ہوتا ہے۔ جب آپ کو فکر نہیں ہے تو مجھے اپنی کیا فکر ہے۔

ونے سنگھ: بھائی میں تو مجبور ہوں۔ چلا ہی نہیں جاتا۔

ڈاکیہ: میں آپ کو کندھے پر بٹھا کر لے چلوں گا۔ پر یہاں نہ چھوڑوں گا۔

ونے سنگھ: بھائی! تم بہت دق کر رہے ہو۔ چلو مگر میں آہستہ آہستہ چلوں گا۔ تم نہ ہوتے تو آج میں یہیں پڑ رہتا۔

ڈاکیہ: آپ نہ ہوتے تو میری جان کی خیریت نہ تھی۔ یہ نہ سمجھئے کہ میں صرف آپ کی خاطر اتنی ضد کر رہا ہوں۔ میں اتنا دھرماتما نہیں ہوں۔ اپنی حفاظت کے لیے آپ کو ساتھ ساتھ لیے چلتا ہوں۔ (آہستہ سے) اس وقت میرے پاس ڈھائی سو روپے ہیں۔ دوپہر کو ایک جگہ سو گیا۔ بس دیر ہو گئی۔ آپ میرے بھاگ سے مل گئے۔ نہیں تو ڈاکوؤں سے جان نہ بچتی۔

ونے سنگھ: یہ تو بڑے جوکھم کی بات ہے۔ تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟

ڈاکیہ: میرے ہتھیار آپ ہیں۔ آپ کے ساتھ مجھے کوئی کھٹکا نہیں ہے۔ آپ کو دیکھ کر کسی ڈاکو کی مجال نہیں کہ مجھ پر ہاتھ اٹھا سکے۔ آپ نے ڈکیتوں کو بھی بس میں کر لیا ہے۔

دفعتاً گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کان میں آئی۔ ڈاکیہ نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ پانچ سوار بھالے اٹھائے گھوڑے بڑھائے چلے آتے تھے۔ اس کے ہوش اڑ گئے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ بولا۔ ''لیجیے سب آ ہی پہنچے۔ ان سب کے مارے ادھر راستہ چلنا مشکل ہو گیا ہے۔ بڑے خونی ہیں۔ سرکاری ملازموں کو تو چھوڑنا ہی نہیں جانتے۔ اب آپ ہی بچائیں تو میری جان بچ سکتی ہے۔''

اتنے میں پانچوں سوار سر پر آ پہنچے۔ ان میں ایک نے پکارا۔ ''اے ڈاکیے! ادھر آ۔ تیرے تھیلے میں کیا ہے؟''

ونے سنگھ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے لکڑی کے سہارے اٹھے کہ اتنے میں ایک سوار نے ڈاکیہ پر بھالے کا وار کیا۔ ڈاکیہ فوج میں رہ چکا تھا۔ اس نے وار کو تھیلے پر روکا۔

بھالا تھیلے کے پار ہو گیا۔ وہ دوسرا وار کرنے ہی والا تھا کہ و نے سنگھ سامنے آ کر بولے۔ ''بھائیو! یہ کیا اندھیر کرتے ہو؟ کیا تھوڑے سے روپیوں کے لیے ایک غریب کی جان لے لوگے؟''

سوار: جان اتنی پیاری ہے تو روپے کیوں نہیں دیتا؟

و نے سنگھ: جان بھی پیاری ہے اور روپے بھی پیارے ہیں۔ دو میں سے ایک بھی نہیں دے سکتا۔

سوار: تو دونوں ہی دینے پڑیں گے۔

و نے سنگھ: تو پہلے میرا کام تمام کر دو۔ جب تک میں زندہ ہوں تمہارا مقصد نہ پورا ہوگا۔

سوار: ہم سادھوؤں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔

و نے سنگھ: جب تک میری ہڈیاں تمہارے گھوڑوں کے پیروں تلے نہ روندی جائیں گی۔ میں سامنے سے نہیں ہٹوں گا۔

سوار: ہم کہتے ہیں سامنے سے ہٹ جاؤ۔ کیوں ہمارے سر ہتیا (خون ناحق) کا پاپ لگاتے ہو؟

و نے سنگھ: میرا جو دھرم ہے وہ میں کرتا ہوں۔ تمہارا جو دھرم ہو وہ تم کرو۔ گردن جھکائے ہوئے ہیں۔

دوسرا سوار: تم کون ہو؟

تیسرا سوار: بیدھا ہوا ہے۔ مار دو ایک ہاتھ گر پڑے۔ پرائسچت (کفارہ) کر لیں گے۔

پہلا سوار: آخر تم ہو کون؟

و نے سنگھ: میں کوئی ہوں تمہیں اس سے مطلب؟

دوسرا سوار: تم تو ادھر کے رہنے والے نہیں جان پڑتے۔ کیوں بے ڈاکیے! یہ کون

ہے؟

ڈاکیہ: یہ تو نہیں جانتا پر ان کا نام ونے سنگھ ہے۔ دھرماتما اور پراپکاری آدمی ہیں۔اس علاقہ میں کئی مہینوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔

ونے سنگھ کا نام سنتے ہی پانچوں سوار گھوڑوں پر سے کود پڑے اور ونے کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔سردار نے کہا۔''مہاراج ہمارا اپرادھ چھما کیجیے۔ہم نے آپ کا نام سنا ہے۔آج آپ کا درشن پا کر ہمارا جینا سپھل ہو گیا۔اس علاقہ میں آپ کا جس گھر گھر گایا جا رہا ہے۔میرا لڑکا گھوڑے سے گر پڑا تھا۔پسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ جینے کی کوئی امید نہ تھی۔آپ ہی کے ساتھ کے ایک مہاراج ہیں اندروت۔انہوں نے آ کر لڑکے کو دیکھا تو فوراً مرہم پٹی کی اور مہینہ تک روز آ کر اس کی دوا دارو کرتے رہے۔لڑکا چنگا ہو گیا۔مُن تو جان بھی دے دوں تو آپ کی ارن نہیں ہو سکتا۔اب ہم پاپیوں کا اودھار کیجیے۔ہمیں آگیا دیجیے کہ آپ کے چرنوں کی دھول ماتھے پر لگائیں۔ہم تو اس لائق بھی نہیں ہیں۔''

ونے نے مسکرا کر کہا۔''اب تو ڈاکیے کی جان نہ لوگے؟ ہمیں تم سے ڈر لگتا ہے۔''

سردار: مہاراج! ہمیں شرمندہ نہ کیجیے۔ ہمارا قصور معاف کیجیے۔ڈاکیہ جی تم آج کسی اچھے کا منہ دیکھ کر اٹھے ہو،نہیں تو اب تک تمہاری جان نکل گئی ہوتی۔میرا نام سنا ہے نا؟ بیر پال سنگھ میں ہی ہوں جس نے راج کے نوکروں کو نیست و نابود کر دینے کی قسم کھائی ہے۔

ونے سنگھ: راج کے نوکروں پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو؟

بیر پال: مہاراج! آپ کئی مہینوں سے اس علاقہ میں ہیں۔کیا آپ کو ان لوگوں کی کرتوتیں معلوم نہیں ہیں؟ یہ لوگ رعایا کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ان میں نہ دیا ہے نہ دھرم۔ ہیں ہمارے ہی بھائی بند، پر ہماری ہی گردن پر چھری چلاتے ہیں۔کسی نے ذرا صاف کپڑے پہنے اور یہ لوگ اس کے سر ہوئے۔جسے رشوت نہ

دیجیے وہی آپ کا دشمن ہے۔ چوری کیجیے، ڈاکے ڈالیے، گھروں میں آگ لگائیے، غریبوں کا گلا کاٹیے، کوئی نہ بولے گا۔ بس سرکاری نوکروں کی مٹھیاں گرم کرتے رہیے۔ دن دہاڑے خون کیجیے پر پولیس کی پوجا کر دیجیے۔ آپ بیداغ چھوٹ جائیں گے اور آپ کے بدلے کوئی بے قصور پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ کوئی فریاد نہیں سنتا، کون سنے، سبھی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ یہی سمجھ لیجیے کہ خونخوار جانوروں کا ایک غول ہے۔ سب کے سب مل کر شکار کرتے ہیں اور پھر مل جل کر کھاتے ہیں۔ راجہ ہے وہ کاٹھ کا الو۔ اسے ولایت میں جا کر علماء کے سامنے لمبی چوڑی تقریریں کرنے کا خبط ہے۔ میں نے یہ کیا، میں نے وہ کیا۔ بس کوری ڈینگیں مارنا ان کا کام ہے۔ یا تو ولایت کی سیر کرے گا یا وہاں انگریزوں کے ساتھ شکار کھیلے گا۔ سارے دن انہی کی جوتیاں سیدھی کرے گا۔ اس کے سوا اسے کوئی کام نہیں۔ رعایا مرے یا جیے اس کی بلا سے۔ بس خیریت اسی میں ہے کہ عملے جس کل بٹھائیں اسی کل بیٹھیے۔ شکایت نہ کیجیے، زبان نہ ہلائیے، روئیے تو منہ بند کر کے۔ ہم نے مجبور ہو کر اس خونیں راستہ پر قدم رکھا ہے۔ کسی طرح تو ان بدمعاشوں کی آنکھیں کھلیں۔ انہیں معلوم ہو کہ ہمیں بھی سزا دینے والا کوئی ہے۔ یہ حیوان سے انسان بن جائے۔

ونے سنگھ: مجھے یہاں کے حالات سے کچھ تو واقفیت تھی مگر یہ معلوم نہ تھا کہ اتنی بری حالت ہے۔ میں اب خود راجہ صاحب سے ملوں گا اور یہ ساری باتیں ان سے کہوں گا۔

بیر پال: مہاراج کہیں ایسی غلطی بھی نہ کیجیے گا، نہیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ اندھیر نگری ہے۔ راجہ میں اتنا ہی گیان ہوتا تو راج کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ وہ الٹا آپ کے سر جائے گا۔

ونے سنگھ: اس کی فکر نہیں۔ اطمینان تو ہو جائے گا کہ میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ مجھے تم سے بھی کچھ کہنا ہے۔ تمہارا یہ خیال کہ اس قتل و غارت گری سے حکام میں رعایا

پوری آ جائے گی، میرے رائے میں محض بے بنیاد اور صرف وہم ہے۔ مرض کو دور کرنے کے لیے مریض ہی کو ختم کر دینا نہ تو قرین مصلحت ہے اور نہ قرین انصاف۔ آگ آگ سے ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ پانی سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔

بیر پال: مہاراج! ہم آپ سے بحث تو نہیں کر سکتے مگر اتنا جانتے ہیں کہ زہر کا اثر زہر ہی سے زائل ہوتا ہے۔ جب انسان برائی کے انتہائی درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ جب اس میں دیا اور دھرم کا نشان نہیں رہ جاتا۔ جب اس کی انسانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ حیوانیت کے کام کرنے لگتا ہے۔ جب اس میں روحانیت کی روشنی دھندلی پڑ جاتی ہے۔ تب اس کے لیے صرف ایک ہی تدبیر باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے سزائے موت۔ شیر جیسا خونخوار درندہ خدمت سے تابع ہو سکتا ہے مگر خود غرضی کو کوئی خدائی طاقت نہیں مٹا سکتی۔

ونے سنگھ: ایسی طاقت ہے تو۔ ہاں اس کا مناسب استعمال ضروری ہے۔

ونے سنگھ نے ابھی بات بھی پوری نہ کی تھی کہ دفعتاً کسی طرف سے بندوق کی آواز کانوں میں آئی۔ سواروں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک طرف گھوڑے چھوڑ دیئے۔ دم کے دم میں گھوڑے پہاڑوں میں جا کر غائب ہو گئے۔ ونے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ بندوق کی آواز کہاں سے آئی اور پانچوں سوار کیوں بھاگے؟ ڈاکیے سے پوچھا۔ ''یہ سب کدھر کو جا رہے ہیں۔''

ڈاکیہ: بندوق کی آواز نے کسی شکار کی خبر دی ہوگی، اسی طرف گئے ہیں۔ آج کسی سرکاری نوکر کی جان پر ضرور بنے گی۔

ونے سنگھ: اگر یہاں کے سرکاری ملازموں کی یہی کیفیت ہے جیسا کہ انہوں نے بیان کیا تو مجھے بہت جلد مہاراج کی خدمت میں جانا پڑے گا۔

ڈاکیہ: مہاراج۔ اب آپ سے کیا پردہ ہے۔ سچ مچ یہی حال ہے۔ ہم لوگ تو ٹکے کے ملازم ٹھہرے۔ چار پیسے اوپر سے نہ کمائیں تو بال بچوں کو کیسے پالیں۔ تنخواہ

ہے سو سال بھر نہیں ملتی لیکن یہاں تو جتنے ہی اونچے عہدہ پر ہے، اس کا پیٹ بھی اتنا ہی بڑا ہے۔

دس بجتے بجتے دونوں آدمی جسونت نگر پہنچ گئے۔ وہ نے بستی کے باہر ہی ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور ڈاکیہ سے جانے کو کہا۔ ڈاکیہ نے ان سے اپنے گھر چلنے کے لیے بہت اصرار کیا۔ جب وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے تو اپنے گھر سے ان کے واسطے کھانا بنوا لایا۔ کھانے کے بعد دونوں آدمی اسی جگہ لیٹے۔ ڈاکیہ انہیں تنہا چھوڑ کر گھر نہ گیا۔ وہ تو تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی سو گیا۔ پر وہ نے کو نیند کہاں۔ رانی جی کے خط کا ایک ایک لفظ ان کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ رانی نے لکھا تھا کہ تم نے میرے ساتھ اور قوم کے ساتھ دغا کی ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گی۔ تم نے میری تمناؤں کو برباد کر دیا۔ تم اتنی آسانی سے نفس کے غلام بن جاؤ گے۔ اس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ تمہارا وہاں رہنا بے فائدہ ہے۔ گھر لوٹ آؤ اور شادی کر کے عیش و عشرت میں زندگی بسر کرو۔ قومی خدمت کے لیے جس طرز عمل کا ہونا ضروری ہے، جس دل و دماغ کا ہونا لابدی ہے، وہ تم نے نہیں پایا اور نہ اسے پا سکو گے۔ شباب کے زمانہ میں ہم لوگ اپنی قابلیتوں کا غلط اندازہ کر لیتے ہیں۔ تم بھی اسی مغالطہ میں پڑ گئے۔ میں تمہیں برا نہیں کہتی، تم شوق سے لوٹ آؤ۔ دنیا میں سبھی اپنی اپنی غرض میں لگے ہیں، تم بھی اسی کے خیال میں محو ہو جاؤ، ہاں اب مجھے تمہارے اوپر وہ گھمنڈ نہ ہوگا جس پر میں پھولی ہوئی تھی۔ تمہارے والد ماجد کو ابھی یہ حال معلوم نہیں ہے۔ وہ سنیں گے تو نہ جانے ان کی کیا حالت ہوگی، لیکن اگر تمہیں یہ بات ابھی معلوم نہیں ہے تو میں بتلائے دیتی ہوں کہ تمہیں اپنی عشق بازیوں کے لیے کوئی دوسرا میدان تلاش کرنا پڑے گا کیونکہ مس صوفیہ کی منگنی مسٹر کلارک سے ہو گئی ہے اور دو چار روز میں شادی بھی ہونے والی ہے۔ یہ اس لیے لکھتی ہوں کہ تمہیں صوفیہ کے بارے میں کسی قسم کا وہم نہ رہے گا اور تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ جس کے